عارف سیالکوٹی

اقبال کا نظریۂ تعلیم

قوموں کی زندگی میں تعلیم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تعلیم ہی انسان کو سفید و سیاہ، خوب و زشت اور نیک و بد میں امتیاز کا شعور بخشتی، صحیح راہ کے انتخاب میں معاونت کرتی، نصب العین اور ضابطۂ حیات کی تشکیل و تکمیل میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ ہر زندہ اور خود مختار قوم کا نظریۂ تعلیم اس کے نصب العین، مقاصدِ حیات، ماضی کی رخشندہ روایات، قابلِ فخر کارناموں، تہذیب و تمدن اور اخلاق و آداب کا مظہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم ایک خاص نظریۂ حیات اور ضابطۂ تہذیب و معاشرت کی دعوے دار ہو لیکن اس کا نظامِ تعلیم اس کے برعکس ہو تو وہ جسمانی طور پر آزاد ہوتے ہوئے بھی ذہنی اعتبار سے آزاد نہیں ہوتی۔ دوسری اقوامِ عالم کی اندھی مقلد ہوتی ہے اور ایک خوش نما دلفریبی میں مبتلا۔ جیسا کہ اقبال کہتے ہیں کہ:

علم غیر آموختی، اندوختی — روئے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش می بری — من ندانم، تو، توئی یا دیگری
عقلِ تو زنجیریِ افکارِ غیر — در گلوئے تو نفس از تارِ غیر

اقبال کی موجودہ نظامہائے تعلیم سے بیزاری حقائق پر مبنی ہے۔ کافی غور و فکر اور نقد و نظر کے بعد انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قدیم طریقۂ تعلیم دنیا بیزاری، بے عملی، گوشہ نشینی اور تنگ نظری کا داعی ہے تو جدید نظامِ تعلیم دنیا پرستی، ابن الوقتی، غلط روی، خود فریبی اور خود نمائی کا معلم ہے۔ ایک طرف تعویذ گنڈوں اور عملیات کے ذریعے جنات پر قابو پانے کا دھندا چل رہا ہے تو دوسری طرف حیرت پسندی ترقی اور عروج و کمال کے نام پر انسانیت سے بغاوت، زبان درازی، گستاخی اور انتہا پسندی کے جراثیم کی پرورش کی جا رہی ہے۔

اقبال خانقاہی نظامِ تعلیم اور دینی مدارس کے نصاب کو اس لیے ناپسند کرتے ہیں کہ یہاں کے طلبا قرآن و سنت اور فقہی مسائل سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن دین کی روح اور اسلام کے جوہر سے ناآشنا

ہوتے ہیں۔ نیز وہ تسخیرِ فطرت، دنیاوی معاملات، کاروبارِ حیات، جہاں بینی، سیاسی نشیب و فراز، معاشی اُتار چڑھاؤ، دنیا کی مختلف نظریاتی تحاریک، لادینی فلسفوں اور بین الاقوامی مسائل سے غیر متعلق ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی کبھار جلیل القدر، وسیع الظرف، بالغ نظر، عمل آشنا، حکیم و نکتہ ور اور جید علما بھی ظہور میں آتے ہیں مگر ان کو مستثنیات میں سمجھنا ہی بہتر ہوگا۔ ان معدودے چند قابلِ قدر علمائے دین سے قطع نظر اقبال کے یہ اشعار مُلّا کی فطرت کے صحیح عکاس معلوم ہوتے ہیں:

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے، الٰہی میری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا — اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اقبال ان مکتبوں کی طرف سے مایوس ہیں۔ یہ ادارے تعطّل، جمود، بے عملی، انتشار و افتراق اور فی سبیل اللہ فساد کا گہوارہ ہیں۔ یہاں قیام، رکوع، سجود، تسبیح اور مناجات وغیرہ کی ترغیب تو دی جاتی ہے لیکن سخت کوشی، جہاد، عمل، حق گوئی، بے باکی، بے غرضی، بلند ہمتی، دلیری، جرأت اور خودی کے جوہر مفقود ہیں۔ اسی لیے اقبال بصد حسرت و یاس کہتے ہیں کہ:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک — نہ زندگی، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ
کریگی داورِ محشر کو شرمسار اک روز — کتابِ صوفی و مُلّا کی سادہ اوراقی

ان تصورات و خصوصیات کے فقدان نے اسلام کی سراپا عمل اور جدوجہد سے پُر زندگی کو رہبانیت سے آشنا کر دیا۔ جیسا کہ اقبال کہتے ہیں:

یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علمِ لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال زندگی کے ہر مسئلے کو اسلامی آداب و حقائق کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں اور ہر شعبۂ حیات کو دین کی رہنمائی میں ترقی پذیر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ میکاولی کے نظریے کے تحت یورپ میں دین اور سیاست کی جدائی کو تشویش ناک نظروں سے دیکھتے ہیں اور اُسے عالمِ انسانیت کے لیے مہلک تصور کرتے

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس سلسلے میں دوسرا قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد ہمہ گیر اور اجتماعی نشوونما ہے اور طلبا کے ذہنی، اخلاقی، جسمانی، روحانی اور وجدانی پہلو کو ایک خاص ترتیب اور توازن کے ساتھ ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا ہے جو انسانیت کے جوہر یعنی خودی کی نشوونما اور استحکام کا باعث بنے۔ افلاطون کے نظریۂ مرگ وحیات سے اختلاف کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ :

حیات و موت نہیں التفات کے لائق فقط خودی ہے جو اپنی نگاہ کا مقصود

اقبال جدید نظامِ تعلیم کے بھی مخالف ہیں۔ یہ مخالفت مولویانہ دین داری یا ماضی پرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے پس پردہ چند فلسفیانہ تاریخی حقائق ہیں۔ زندگی محض علم کا نام نہیں اس کے لیے عمل بھی ضروری ہے اور انسان میں جوشِ عمل اور شدتِ ولولہ صرف مذہب سے بے پناہ جذباتی لگاؤ سے ہی پیدا ہوتا ہے کیونکہ اگر سامنے کوئی واضح منزل نہ ہو تو صحیح سمت میں سفر کرنے کا سوال بے سود ہے۔ جدید طریقِ تعلیم مادیت پر مبنی ہے کیونکہ یہ اخلاقی، دینی اور روحانی اقدار سے تہی ہے :

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اس نظامِ تعلیم کا مقصد صرف حصولِ دنیا ہے اور مقصود و مطلوب دنیاوی فوائد و لذائذ ہیں جسے اقبال زہرِ ہلاہل کہتے ہیں :

وہ علم نہیں زہر ہے افراد کے حق میں جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جَو

اقبال کے نزدیک علم کا مقصد کتابی کیڑا بننا، موٹی موٹی کتابیں پڑھنا، انھیں رٹنا اور ڈگریاں حاصل کرنا نہیں جن کے سہارے اعلیٰ عہدے اور عمدہ ملازمتیں تلاش کی جائیں :

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے قبض کی روح تیری، دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے تیرا زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
مدرسہ نے تیری آنکھوں سے چھپایا جن کو خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

یہ تمام پاپڑ بیلنے کے باوجود معاشی مسئلہ دشوار تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اقبال زندگی کو معاش نہیں کہتے اسے خونِ جگر کہتے ہیں :

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

یہیں سے اقبال کے نظریۂ تعلیم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ علم کے راہوار کو بے لگام چھوڑنے کے قائل نہیں بلکہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح اسے بھی دین کے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں بصورت دیگر یہ قوت، بربادی، تباہی اور ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے۔ وہ خواجہ غلام السیدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں ـــ "علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ یہ علم، علم حق کی ابتدا ہے جیسا کہ میں نے جاوید نامہ میں لکھا ہے کہ:

علمِ حق اول حواس آخر حضور آخرِ اُو می نہ گنجد در شعور

وہ علم جو شعور میں نہیں سما سکتا اور جو علم کی آخری منزل ہے اس کا نام عشق ہے۔ علم اور عشق کے متعلق جاوید نامہ میں کئی اشعار ہیں مثلاً:

علم بے عشق است از طاغوتیاں علم با عشق است از لاہوتیاں

مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو یعنی اس علم کو جس کا دار و مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت حاصل ہوتی ہے مسلمان کرے: ـــ بولہب را حیدرِ کرار کن ـــ اگر یہ بولہب حیدرِ کرار بن جائے یعنی اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوعِ انسان کے لیے سراسر رحمت ہے ـــ انسان علم کی مدد سے خود کو پہچانے، اپنی خلقت کے مقصد کو جانے، اپنے مقام سے آگہی حاصل کرے عمل سے پہلے یقین پیدا کرے۔ یقین محکم سے عشق کی آگ کو تیز کرے، خودی کے آخری نقطۂ عروج تک پہنچنے کے لیے جد و جہد کرے۔ تن آسانی، غفلت شعاری اور آرام طلبی ترک کرے:

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے تم مسلماں ہو، یہ اندازِ مسلمانی ہے

اور اس کے بعد وہ زندگی کو گردشِ پیہم کہہ کر بھی عمل کی ترغیب دلاتے ہیں کہ:

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

اور پھر یہ کہتے ہیں کہ:

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

خود شناسی، یقین محکم، خدا شناسی اور اصولِ فطرت سے آگہی کے بعد اگر عملی قدم اُٹھایا جائے گا تو زندگی فردوسِ بریں کا نمونہ بن جائے گی بصورتِ دیگر یہ دنیا فتنہ و فساد کا جہنم بن جائے گی کیونکہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ان خصوصیات کو طلبا کے دل میں جاگزیں کرنے کے لیے وہ مکتب کی کرامت کے علاوہ فیضانِ نظر کو بھی اہم سمجھتے ہیں:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

یہی وجہ ہے کہ وہ پیرِ حرم کو رسم و رہِ خانقہی کو چھوڑنے اور نواتے سحری سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتے ہیں:

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا

اقبال اپنی ملت کے "شاہین بچوں" کو "شاہین دیکھنے کے خواہاں ہیں تاکہ ان کی قوتِ پرواز اور صلاحیتِ کارکردگی ارفع و پاکیزہ ہو۔ وہ دوسروں کے دستِ نگر نہ ہوں، اپنی روزی اپنے زورِ بازو اور جائز ذرائع سے حاصل کریں وہ رزقِ حلال کو بلند پروازی کے لیے اہم قرار دیتے ہیں۔ ان کا نظریۂ تعلیم اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ دین و دنیا اور عقل و دانش میں جدائی نہ ہو:

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

ان کے خیال میں عقل اور عشق دونوں زندگی کے خادم ہیں وہ چاہتے ہیں کہ مکتبوں میں دنیوی اور روحانی دونوں قسم کی اعلیٰ ترین تعلیم دی جائے۔ یہاں کے فارغ التحصیل نہ صرف علومِ متداولہ کے تعلیم یافتہ بالغ نظر، وسیع الظرف اور اچھے انسان ہوں بلکہ مجسمۂ اخلاق، پیکرِ سیرت، سراپا شرافت اور خدا پرست انسان ہوں۔ وہ عقل کی محدود رہنمائی کو بھی تسلیم کرتے ہیں کیونکہ عقلِ جزوی سے اشیائے عالم کا محدود خارجی علم حاصل ہوتا ہے اور عقلِ کلی یعنی عشق سے دردمندی اور عرفان نصیب ہوتا ہے:

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل خودی ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

دل بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

دل کے نور سے عشق اور خودی نشو و نما پاتی ہے۔ انسان باطل نظریات اور ابلیسی تصورات سے

ٹکرانے کے لیے سراپا عمل بن جاتا ہے :

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کی رفیق — یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

اقبال دماغ کی بیداری کے ساتھ ساتھ دل کی بیداری چاہتے ہیں کیونکہ : دل بیدار فاروقی دلِ بیدار کراری ۔ دل کی بیداری کے لیے دینی تعلیم اور شرعی اصولوں کو اپنانا ضروری ہے ۔ غرض اقبال ایک ایسا اعتدال پسندانہ نظامِ تعلیم چاہتے ہیں جس میں دین و دنیا کی تفریق نہ ہو، دماغ کے ساتھ دل بھی روشن ہو ۔ علوئے تخیل کے ساتھ تسخیرِ کائنات کا جذبہ بھی ابھرے ۔ عقل و عشق دونوں کی رہنمائی میں نصاب مرتب کیا جائے، جو حق گوئی، بے باکی، سادگی، پاکیزگی، خوبیٔ کردار، جوشِ عمل اور تخلیق پر مائل کرے ۔

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے ۔ (جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اُسے صوفی سمجھا جائے) ۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا ۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نکتۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے ۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین ۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں ۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا ۔

(مکتوب بنام سراج الدین پال، اقبال نامہ اول، ۴۴)